بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جماعتِ اسلامی نے پچاس سال سے جس کام کا بیڑا اُٹھایا ہوا ہے وہ دعوت الی اللہ، شہادتِ حق، انقلابِ امامت اور اقامتِ دین کے لیے منظم جدوجہد کا کام ہے۔ یہ کام ایک عظیم الشان اور گراں بار کام ہے۔ دعوت اِلی اللہ کا کام یہ ہے کہ ہم اللہ کے زیادہ سے زیادہ بندوں کو، مردوں کو بھی اور عورتوں کو بھی، جوانوں کو بھی اور بوڑھوں کو بھی، پڑھے لکھوں کو بھی اور اَن پڑھ اور جاہلوں کو بھی، موافقین کو بھی اور مخالفین کو بھی، سب کو اللہ کی طرف بلائیں کہ وہ اس کے ساتھ جُڑ جائیں، صرف اس کے بندے بن کر زندگی بسر کریں، اور اس سے ملاقات کی تیاری کریں۔ یہ کام ایک انتہائی بھاری ذمہ داری ہے۔ شہادتِ حق کا کام یہ ہے کہ جہاں تک ہمیں استطاعت ہو، ہماری زبان اور قلم سے جو کچھ نکلے وہ حق کے مطابق ہو، اور ہم جو کام کریں اور جو رویہ اختیار کریں وہ بھی حق کے مطابق ہو۔ اس کا کم سے کم لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ہمارے قول اور فعل میں کوئی تضاد نہ ہو۔ اس معیار پر پورا اُترنا بھی کوئی آسان اور معمولی کام نہیں۔ اسی طرح انقلابِ امامت اور اقامتِ دین کا کام بھی کوئی ہلکا اور آسان کام نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ "دُنیا کے پورے نظامِ زندگی کو بدل ڈالنا ہے، دُنیا میں جو نظام خدا سے بغاوت پر قائم ہے اُسے بدل کر خدا کی اطاعت پر قائم کرنا ہے، اور اس کام میں تمام شیطانی طاقتوں سے جنگ ہے"۔

یہ کام وہ کام ہیں جن کو بجا طور پر کارِ رسالت کہا جا سکتا ہے۔ یہ خیال تو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں آنا چاہیے کہ ہم گذشتہ پچاس سال میں، جو کچھ بھی کر سکے ہیں، ہم سے جتنی کچھ بھی اللہ کے دین کی خدمت بن پڑی ہے، اس سے اس عظیم الشان کام کا کسی درجہ میں بھی حق ادا ہو سکا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا، اور رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِیْٓ اَمْرِنَا ہی ہمارے قلب و رُوح اور زبان کا وظیفہ ہونا چاہیے۔ لیکن اللہ کے اس عظیم الشان فضل و احسان پر ہم جتنا شکر ادا کریں وہ کم ہے کہ اُس نے نہ صرف ہمیں اقامتِ دین کے لیے منظم جدوجہد کی راہ اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائی، بلکہ عملاً اپنے دین کی خدمت کی توفیق بھی عنایت کی۔

مستقبل کی راہوں پر آگے بڑھتے ہوئے، یہ ضروری ہے کہ ہم ہر وقت، اور خصوصاً اس موقع پر، یہ یاد رکھیں کہ آج تک اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو کچھ بھی کامیابی عطا فرمائی ہے اس کے اصل اسباب کیا ہیں۔ اس لیے کہ عوامی دعوت، اصلاحِ معاشرہ اور پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانے کی جو جدوجہد ۱۹۴۷ء میں شروع ہوئی تھی اس کو مستقبل میں تیز سے تیز تر ہی کرنا ہوگا۔ اس کام میں اب تک جو بھی کامیابی ہوئی ہے وہ انہی اسباب سے ہوئی ہے، اور آئندہ جو کچھ ہوگی وہ بھی انہی اسباب سے ہوگی۔ بلکہ بڑھتی ہوئی عوامی اور سیاسی جدوجہد کے دَور میں یہ زیادہ ضروری ہے کہ ہم ان اسباب کے اہتمام کی فکر کریں، نہ یہ کہ اس جدوجہد کے بارے ہی میں شک و شبہ میں پڑ جائیں، یا واپس پلٹنے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیں۔

اپنے نبیؐ کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان اسباب کو دو باتوں کے اندر سمیٹ کر بیان فرما دیا ہے ایک نصرتِ الٰہی، دوسرے جماعتِ مومنین — اور واضح کر دیا ہے کہ تائیدِ الٰہی، کہ جس کے بغیر کوئی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی، انہی دو اسباب سے حاصل ہوتی ہے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ (الانفال - ۶۲)

ایک یہ کہ ہم ایسے بنیں کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کے مستحق ہوں، اور اس کی نصرت ہمیں حاصل ہو۔ دوسرے یہ کہ ہم صحیح معنوں میں مومنین کی ایک جماعت ہوں۔

جہاد فی سبیل اللہ میں نصرتِ الٰہی کا مستحق بننے کے لیے اصل چیز یہ ہے کہ ہم واعتصموا باللہ کے اہتمام و سعی میں لگے رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ الحج کے آخر میں بھی اس طرف واضح اشارہ فرمایا ہے اور ہر مرحلہ میں اس کی ہدایت کی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی برابر اس کی تاکید فرماتے رہے۔ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ۵۰ سال قبل، آغازِ کار ہی میں اس امر کو کھول کر بیان کر دیا تھا "اس تحریک کی جان دراصل تعلق باللہ ہے۔ اگر اللہ سے آپ کا تعلق کمزور ہو تو آپ حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے اور کامیابی سے چلانے کے اہل نہیں ہو سکتے" (روداد حصہ اوّل، ص ۴)

اعتصام باللہ کی یہ اہمیت انسانی زندگی کی اس بنیادی حقیقت کی وجہ سے ہے جس کی علامہ اقبال نے بڑے خوب صورت انداز میں یوں نشاندہی کر دی ہے:

زندگانی را بقا از مدعا است
کاروانش را درا از مدعا است

انسانی جسم کی زندگی تو سانس کے ساتھ وابستہ ہے، لیکن اس کی معنوی اور اجتماعی زندگی کی رُوح اس کا مُدعا اور مقصد ہے۔ اور انسانی جماعتوں کا تو کوئی جسمانی وجود ہوتا ہی نہیں، ان کی زندگی کے لیے مدعا و مقصد ہی رُوح کی حیثیت رکھتا ہے۔

اعتصام باللہ کا سب سے اہم اور بنیادی پہلو، جو ہماری نگاہوں سے اوجھل نہ ہونا چاہیے، یہی ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی ہمارا مُدعا اور مقصود و مطلوب ہے۔ یعنی اس کی رضا، اور اس کا انعام جنت۔ یہی ہدف اور منزل ہیں۔ فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰہِ کی دعوت اور جنت و مغفرت کی طرف سَارِعُوْا اور سَابِقُوْا کی صدائیں اللہ کے مُدعا و مقصود اور ہدف ہونے ہی کو بیان کر رہی ہیں۔ اسی لیے ہم نے اپنے دستور میں یہ بات رقم کی ہے کہ جس چیز پہ ہماری نگاہیں جمی رہنی چاہئیں، جس سے ہٹ

کہ ہماری نگاہوں کو اِدھر اُدھر بھٹکنا نہیں چاہیے، وہ رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ انفرادی طور پر آخرت میں ہماری کامیابی کا انحصار تو اس پر ہے ہی، جماعتی طور پر دنیا میں ہماری جان، ہماری بقا کا سامان، ہمارے کارواں کی پیش رفت اور کامیابی بھی اسی میں ہے۔

رضائے الٰہی کی بات اکثر ہماری زبانوں پر رہتی ہے، ہم صبح و شام اس کا وظیفہ پڑھتے ہیں۔ ہے بھی سیدھی اور صاف بات۔ لیکن سوچ اور عمل کے لیے اس مختصر اور سادہ سی بات کے بعض اہم اور نازک مضمرات ہیں۔

ا۔ اگر رضائے الٰہی ہی ہمارا نصب العین ہے، تو ہر کام میں ہمارا مدّعا اور ہدف یہی، اور صرف یہی ہونا چاہیے۔ اس میں نہ کوئی آمیزش ہونا چاہیے، نہ یہ ہو کہ زبان پر تو یہ مدّعا ہو اور دل میں چپکے چپکے کسی اور ہی مدّعا نے گھر کر لیا ہو۔ استخلاف فی الارض کا وعدہ ایسی ہی مخلصانہ بندگی کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے۔ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا (النور) ــ "صرف میری ہی غلامی کریں اور اس غلامی میں میرے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ کریں"۔ بندگی میں حنیف و مخلص ہونے کا قرآن مجید میں بے شمار جگہ ذکر ہے۔ حنیف وہ ہے جو ہر چیز سے کٹ کر صرف اللہ کا ہو رہے۔

کیا رضائے الٰہی ہی فی الواقع ہمارا نصب العین ہے؟ چند چھوٹے چھوٹے معیار ہیں جن پر پرکھ کر ہم اپنا امتحان کر سکتے ہیں۔ دُنیا میں اپنی منزل تک پہنچنے میں تاخیر یا ناکامی پر ہمیں مایوسی کیوں ہو؟ اُوپر سے کوئی کہنے والا، ڈھکیلنے والا نہ ہو، تو ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر کیوں بیٹھ جائیں؟ اختلاف رائے ہو، تو ہمیں اپنی رائے منوانے پر اصرار کیوں ہو؟ ساتھی غلطیاں کریں تو ہم سمجھانے کے لیے نرمی و دلسوزی کے بجائے شدت و غلظت کیوں اختیار کریں؟ منصب سے ہٹنے کی نوبت نظر آئے، تو ہمیں خوشی کے بجائے خلش اور اس پر جمے رہنے پر اصرار کیوں ہو؟ ہمارے ہی ساتھی اگر ایسی بات کہہ دیں یا کر دیں جو ہمیں ناگوار ہو یا جس سے ہمارے نفس کو چوٹ لگتی ہو، تو ہم

غصّہ سے بے قابو کیوں ہونے لگیں، ہماری بیویاں کیوں چڑھیں، ہماری زبان تلخ کیوں ہو جائے، ہم بدلہ لینے پر کیوں اُتر آئیں؟ ہمیں تقریر کی دعوت نہ ملے، اسٹیج پر موزوں مقام نہ ملے، مناسب عزت و تکریم نہ ہو، تو ہمارا دل کیوں بھینچنے لگے اور اس میں غیظ و غضب کا شعلہ کیوں سر اُٹھائے؟

میں اپنے رفقاء سے حُسنِ ظن رکھتا ہوں، اور مجھے پوری اُمید ہے کہ وہ اِن باتوں پر خود کو تولیں گے تو پورے اُتریں گے۔ لیکن شیطان کے کید و خدع کو کبھی ہلکا نہ سمجھنا چاہیے، اور اپنے محاسبۂ نفس سے کبھی غافل نہ ہونا چاہیے۔ وہ کسی کا یہ بدہ میں نہ ڈال سکے..... تو نیک کاموں کو غارت کرنے کے درپے رہتا ہے۔ اور نیک کام جتنا اعلیٰ درجہ کا ہو، اور جہاد سے زیادہ اعلیٰ کام کیا ہو سکتا ہے، تو وہ اپنی وسوسہ کاریاں اتنی ہی شدید کر دیتا ہے۔

اعتصام باللہ اور ابتغاء مرضات اللہ کی اس جستجو میں جہاد، عوامی دعوت اور سیاسی جدوجہد ایک نازک امتحان سے دوچار کر دیتی ہے۔ ایک طرف، یہ کام اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ آپ عام لوگوں کے درمیان رہیں، ان میں دعوت و تعلیم کا کام کریں، ان کو اپنے ساتھ جمع کریں، ان میں اپنا اثر و رسوخ بڑھائیں، ان کو ایک قوت میں تبدیل کریں۔ دوسری طرف، ان میں ہر کام اخلاص کے لیے پُر خطر ہے۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ للّٰہیت اور اخلاص کے حصول کا راستہ یہی ہے کہ انسان یہ کام ترک کر دے، گوشۂ عزلت میں بیٹھ جائے، دوسرے لوگوں سے سروکار نہ رکھے۔ لیکن پھر دعوت اِلیٰ اللہ، اصلاحِ مخلوق، اور قیام قسط کا کام کس طرح ہوگا؟ اس لیے اگرچہ امتحان نازک اور کڑا ہے، لیکن کامیابی کی صورت میں اجر بھی بہت عظیم ہے۔ ایک انسان آپ کی سعی و کاوش سے راہِ ہدایت پہ آجائے، یہ ایک ایسا صدقہ جاریہ ہے کہ حد و حساب نہیں۔ یہ بہر حال حقیقت ہے کہ یہ راہ رہبانیت سے زیادہ کڑی راہ ہے۔ اسی لیے اس کو اس اُمّت کی رہبانیت قرار دیا گیا ہے۔

۲ — اللہ کی رضا کوئی ایسا کام کر کے ہرگز بھی حاصل نہیں ہو سکتی جو اس کو

ناراض کرنے والا ہو۔ اس لیے رضائے الٰہی کا حصول جس کی آرزو ہو، اور اس کی جستجو جس کی کاوش ہو، وہ سب سے بڑھ کر خود کو ایسے کاموں سے بچائے گا جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہوں اور ایسے کام رضائے الٰہی اور جہاد فی سبیل اللہ کے نام پر کرنے کی خوفناک جسارت ہرگز نہ کرے گا۔ اسی لیے تقویٰ کو جو در اصل اللہ کی ناراضگی سے بچنے کا نام ہے، نیکیوں میں سرفہرست رکھا گیا ہے اور نیکیوں کا سرچشمہ بتایا گیا ہے۔

شیطان وعدے وعید کے جال بچھاتا ہے، اور سبز باغ دکھا کر اپنے پھندے میں پھانستا ہے۔ اِن میں اس کا ایک بڑا پُرفریب داؤ یہ ہے کہ وہ بُرائیوں کو نیکی کا لبادہ اوڑھا دیتا ہے۔ بُرائی جانتے ہوتے بھی نیکی کی خاطر، انسان بُرائی کے پھندے میں پھنس جاتا ہے۔ اس لیے جو رضائے الٰہی کا طلب گار ہو اُسے یہ اُصول اپنے سامنے رکھنا چاہیے کہ کوئی ایسا کام کر کے جو اللہ کو ناپسند ہو اُس کی رضا حاصل نہیں ہو سکتی۔

لیکن اس معاملے میں کہ کیا کام اللہ کو ناپسند ہیں، دین کے اُصولوں کے دائرہ میں رہنا چاہیے اور غلو سے بچنا چاہیے۔ فرائض بھی واضح ہیں، ان میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ حرام و حلال بھی واضح ہیں۔ طیّبات سب حلال ہیں۔ کسی حرام کو حلال کرنا جتنا بڑا گناہ ہے، حلال کو حرام کرنا بھی اس سے کم درجہ کا گناہ نہیں — اجتہادی اُمور میں، فہمِ نصوص کا معاملہ ہو یا مستنبطات کا، اُصولوں کا ہو یا جزئیات و فروعیات کا، اُس چیز سے سختی کے ساتھ بچنا چاہیے جو اپنے علم کے مطابق، یا جس عالم پر اعتماد ہو اُس کی رائے کے مطابق، اللہ کو ناراض کرنے والی ہو۔ لیکن اگر کسی کی رائے اس معاملہ میں اس سے مختلف ہو اور اس کے پاس دلیل شرعی موجود ہو، یا وہ کسی مختلف رائے رکھنے والے عالم کی رائے پر چل رہا ہو، تو اُس پر اپنی رائے مسلط نہ کرنا چاہیے۔ نہ اس کے بارے میں فتویٰ بازی کی روش اختیار کرنا چاہیے۔ سلف کے زمانہ سے اجتہادی اُمور میں توسع کا معمول یہی

چلا آ رہا ہے۔

۳ ۔ دُنیا میں ملکیت اور تدبیر و تصرف کے سارے اختیارات صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہیں۔ اس لیے نفع و نقصان صرف اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جو نفع پہنچانا چاہے، اُسے کوئی چھین نہیں سکتا۔ جس کا نہ ملنا اُس نے مقدّر کر دیا ہے، وہ کوئی دے نہیں سکتا۔ جو نقصان و ضرر اس نے لکھ دیا ہے اُسے کوئی ٹال نہیں سکتا۔ یہ یقین توحید کی رُوح ہے۔ اِس کے بغیر اقامتِ دین کی راہ طے نہیں ہو سکتی۔ رضائے الٰہی کی جستجو میں بھی قدم بڑھانا ممکن نہیں۔

اِسی سے توکّل پیدا ہوتا ہے۔ توکّل ترکِ اسباب کا نام نہیں، ترکِ رویتِ اسباب کا نام ہے۔ یعنی ہم سارے اسباب جمع کریں، ساری تدابیر اختیار کریں، ہر ایک بہتر سے بہتر ہو، لیکن ان اسباب ہی کو مُسبّب نہ سمجھیں، ان تدابیر ہی کو مدبّر نہ سمجھ بیٹھیں۔ مُسبّب اُس کو سمجھیں جس نے آسمان و زمین کے سارے اسباب و وسائل پیدا کیے اور عرش پہ قائم ہو گیا۔ مدبّر اُس کو سمجھیں جس نے اپنے بارے میں کہا ہے کہ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ۔ (وہ آسمان سے زمین تک ساری تدبیر کرتا ہے)۔

اِس راہ میں بھی ایک نازک مقام آتا ہے۔ ایک طرف توکّل کا تقاضا یہ ہے کہ ہم مقدور بھر ہر قسم کے وسائل جمع کریں۔ قلّت کو کثرت سے بدلنے کی کوشش کریں، اور ضعف کو قوّت سے۔ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ پہ عمل پیرا ہوں۔ دوسری طرف بھولے سے بھی اپنی تعداد اور قوّت پہ نازاں نہ ہوں، اس کا غرّہ نہ ہو، اسی کو اصل سبب نہ سمجھنے لگیں۔ ایسا ہو تو نہ تعداد ہمارے کام آئے گی، نہ مادّی وسائل ۔ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا۔ (جب اپنی کثرتِ تعداد دیکھ کر تم خوش ہونے لگے تو تمہاری کثرتِ تعداد تمہارے کچھ کام نہ آئی، کی صورتِ حال سے سابقہ پیش آ سکتا ہے۔

۴ ۔ اخلاص ہو یا تقویٰ، توکّل ہو یا صبر، جو چیز ان سب کی مضبوطی کا سرچشمہ

ہے، جس سے زندگی اور جدوجہد میں رنگ اور استقامت پیدا ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ہمیں سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ سے محبت ہو۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ (اور ایمان والے سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں)۔ محبت فاتحِ عالم۔ اسی سے اپنے نفس کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں، اور اپنے اندر کی مملکت فتح ہوتی ہے۔ اسی سے انسانوں کے دل فتح ہوتے ہیں۔ اِسی سے مملکتِ ارضی فتح ہوتی ہے۔

سب سے بڑھ کر محبت اللہ سے ہو، نہ اپنے نفس سے نہ جاہ سے نہ دُنیا سے، تو اخلاص کے سارے پُرخطر اور نازک مقامات طے کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ محبت ہو، دل کو لگی ہو، تو کسی بیرونی دباؤ کے بغیر، اپنے اندر کے جذبۂ محبت سے سرشار ہو کر ہم راہِ حق میں سرگرمِ عمل رہتے ہیں۔

اللہ سے محبت ہو تو ہر اُس چیز سے محبت ہو جاتی ہے جس کو اس سے نسبت ہو۔ اُس کے رسولؐ سے، اُس کی کتاب سے، اُس کے گھر سے، اس کے احکام سے، اس کے لیے کام کرنے والی جماعت سے، اس کے راہ میں ساتھ چلنے والوں سے، اور چلانے والوں سے۔ اس محبت کے تقاضوں اور آداب سے کون واقف نہیں۔ اِن تقاضوں اور آداب کو ملحوظ رکھے بغیر محض محبت کے دعوے کچھ فائدہ نہیں دیتے۔

اعتصام باللہ ہی آپ کے لیے قوت کا اصل سرچشمہ ہے۔ اپنے لیے ضبطِ نفس اور شوقِ منزل کا حصول اِسی مدرسہ میں ہو سکتا ہے۔ جماعت کی قوت کا اصل سرچشمہ بھی یہی ہے۔ اِسی کی مدد سے جہاد اور عوامی و سیاسی جدوجہد کی پُرخار راہ پر سے آپ بسلامتی گزر سکتے ہیں۔

اس کے حصول کا راستہ مختصراً اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا مولیٰ و آقا بنائیں، اسی کو اپنا مددگار بنائیں۔ اُسی کے آگے جھک جائیں، اُسی کے